مضمون : افسانوی ادب

کوڈ : 5603

سطح : ایم۔اے اردو

مشق : 01

سمسٹر : خزاں 2018ء

نوٹ: ایم اے اردو کی درسی کتابیں جو یونیورسٹی کی طرف سے بھیجی جاتی ہے ان میں اردو ادب پر مواد بہت قلیل ہے اس کوی وجہ طلبہ کی تحقیقی صلاحیتوں اور اردو ادب پر عبور حاصل کرنے کے لیے خود سے سوالات کو ترتیب دینا مقصود ہوتا ہے اسی وجہ سے طلبہ کو اکثر سوال کے اختصار سے ہونے کی شکایت رہتی تھی اور ٹیوٹرز بھی بھرپور اور طویل مواد پر ممشتمل جواب پر زور دیتے تھے کاشان اکیڈمی نے اسی طرز کو مدنظر رکھتے ہوئے سوالات کی طوالت کا خاص طور پر خیال رکھا اور مواد کو بڑھا کر اس سمسٹر میں جواب ترتیب دیے ہیں امید ہے طلبہ کو ایم اے اردو کی امتحانی مشقیں بنانے میں اس مرتبہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

سوال نمبر1۔ باغ و بہار کے اسلوب پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

جواب:

باغ و بہار کا اسلوب: باغ و بہار کی اہمیت کا سارا راز اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔جملوں کی ساخت، الفاظ کا انتخاب اور ترتیب اتنی بے ساختہ اور برمحل ہے کہ اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جانتے ہیں کہ کون سا لفظ کہاں اور کس موقع پر استعمال کرنا ہے۔ وہ بلا شبہ بے جان الفاظ میں زندگی پیدا کرنے کا فن جانتے تھے۔ پہلے درویش کی بہن جب اپنے بھائی سے گفتگو کرتی ہے تو اس کے الفاظ میں بہن کے سارے جذبات سمٹ آتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ الفاظ خود جذبے کی تصور بن گئے ہیں۔

''اے بیرن۔تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موٹی مٹی کی نشانی ہے تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں''۔

کہا گیا ہے کہ میرامن کی سادگی میں جو پرکاری ہے وہ بڑی ہنرمندی سے پیدا ہوتی ہے وہ عبارت کی دلکشی بڑھانے کے لئے وہ تمام حربے استعمال کرتے ہیں جو شاعری میں مستعمل ہیں مثلاً وزن و آہنگ، قافیہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ مگر وہ یہ کام ایسی چابکدستی سے کرتے ہیں کہ کہیں آورد کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام خوبیاں خود بخود پیدا ہوگئی ہیں اور لکھنے والے نے کسی خاص کاوش سے کام نہیں کیا۔ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے میرامن کی اس خوبی کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں لگایا جا سکتا ہے۔

قافیہ کی مثال: ''اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا شوق نہ ہوتا تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا''

''جو کچھ عقل میں نہ آوے یہ کافر عشق کر دکھاوے''

''نہ کچھ کہہ سکتی نہ اس بن رہ سکتی''

''وہ تماشا ہوا جیسے چودھری کے چاند کو گہن لگتا ہے''

''صبح کو جوگی مانند آفتاب کے نکل آیا''

''اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا جیسے نافرمانی (اودا)

جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے۔

میرامن تشبیہ سے جا بجا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ایک جگہ ماہ پیکر کنیزوں اور خواصوں کے جھرمٹ کی تصور جس طرح کھینچتی ہے اس سے بہتر ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں۔

یہ عالم نظر آیا گویا پر کاٹ کر پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔

چند استعارے بھی دیکھئے۔ یہاں بھی اس نثر نگار نے جو شاعر نہ تھا۔علم بیان کے اس رکن سے اپنی نثر کو زینت بخشی ہے۔

''بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے''

میرامن نے اپنی نثر کو خوش آہنگ بنانے کے لیے اور بھی کئی حربے استعمال کیے ہیں۔بعض اوقات وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہیں۔مثلاً چور چکار۔دانہ دنکا۔کالی کلوٹی وغرہ کبھی تابع مہمل کے استعمال سے اپنی نثر کو حسین بناتے ہیں مثلاً ''جنگل کے چرند پرند شکار اور بھون بھان کر کھا لیتے''

''نیم کے پانی سے زخموں کو دھو دھا کر صاف کیا''۔

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

کبھی ہم وزن وہم معنی الفاظ کے استعمال سے آہنگ پیدا کرتے ہیں مثلاً رعیت آباد۔خزانہ معمور۔لشکر حرفہ۔غریب غربا آسودہ۔ جتنے چور چکار۔ جیب کترے۔صبح خیزیے۔اٹھائی گیرے۔دغاباز تھے۔

میرامن نے اپنی نثر میں جو جو ہنرمندیاں پیدا کی ہیں وہ اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن ان کی نثر محض ان چیزوں کی محتاج بھی نہیں۔بعض اوقات انہوں نے سیدھی سادی سلیس زبان اور فصیح روزمرہ سے جو کام لیا ہے اس کی بھی دور دور تک کوئی مثال نہیں ہوتا۔مثلا یہ فقرے ملاحظہ ہوں۔

''غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہروقت کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا''

''میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ ہوگیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے ایک بوند لہو کی نہ نکلے''

میرامن کی عبارت میں ہندی کے نرم اور رسیلے الفاظ ومحاورات اکثر استعمال ہوئے ہیں۔میرامن نے عربی اور فارسی کے بجائے ہندی کے عام الفاظ و محاورات کے استعمال سے اپنی نثر کو جو مقامیت بخشی ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے مثلاً یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

''دور سے دھاوا مارے آتا ہوں''

''اس پری کا رنگ ایسا نکھرا کہ مکھڑا سورج کی مانند چمکتے اور کندن کی طرح دمکنے لگا''

''وہ گلاب سا بدن سارے پسینے پسینے ہورہا ہے''

''اگر راہ باٹ میں بھینٹ ملاقات ہوجاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے''

باغ و بہار کے اسلوب کی یہی وہ خوبیاں ہیں جنھوں نے اس داستان کو اردو نثر کا شاہکار بنادیا ہے لیکن زبان وبیان کی خوبیوں کے علاوہ اس میں داستان کی حیثیت سے بھی ایسی خوبیاں موجود ہیں۔ جو اسے حیات ابدی بخشتی ہیں مثلاً کہانی کی کامیابی کی پہلی منزل یہ بتائی جاتی ہے کہ کہانی سنانے والا کہانی کی ابتدا اس طرح کرے کہ سننے والا شروع ہی سے کہانی کی فضا میں جذب ہوجائے۔میرامن نے قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور قصے کی ترتیب کچھ اس طرح قائم کی ہے کہ ایک واقعہ گزرنے کے بعد قاری دوسرے واقعے کا منتظر رہتا ہے اور یہ اشتیاق لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہتا ہے۔داستان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ کہانی کہنے والا کہانی اس طرح کہے کہ سننے والے کے دل میں اس کے سچ ہونے کا یقین ہوجائے۔میرامن نے اپنی داستان اپنے معاشرتی نظام کو سامنے رکھ کر پیش کی ہے۔ باغ و بہار کے کرداروں اور رسم ورواج پر تہذیب ومعاشرے کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جو اسے زندگی سے قریب تر رکھتی ہے۔

باغ و بہار اور نوطرز مرصع کے اسلوب کا فرق: میرامن کی زبان میں سادگی، بیان میں حلاوت اور اسلوب میں جو دلکشی ہے اس کا اندازہ نوطرز مرصع اور باغ و بہار کے تقابلی مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔نوطرز مرصع سے پہلے درویش کی داستان کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

''جس وقت زلف خاتون شب کی کمر تک پہنچی اور چشم خلائق کی خمار نشہ غنودگی سے سرمست خواب غفلت کی ہوئی یکا یک ایک صندق چوبیں فراز دیوار حصار کے سے مانند خورشید کے برج حوت کے سے جلا بخشی دیدہ تماش بیں کا ہوا۔فقیر واردات اس حال کے سے متعجب ہوا کہ آیا یہ خیال طلسمات کا ہے و یا مسبب اسباب حقیقی نے اوپر بے کسی میری کے نظر ترحم کی فرما کے خزانہ غیب سے دولت غیر مترقب مرحمت کی''۔

''جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوگئی۔سنسان ہوگیا۔ دیکھا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں آیا کہ یہ کیا طلسم ہے شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگرانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا ہے۔

میرامن کے بیان میں حیرت، سناٹا اور پراسرار فضا کا جو احساس ہے وہ تحسین کے یہاں مفقود ہے۔نیز تحسین کی زبان مصنوعی اور پرتکلف ہے جبکہ میرامن نے روزمرہ کی صفائی کا خیال رکھا ہے اور یہی اس داستان کی کامیابی ہے ورنہ قصہ وہی ہے جو نوطرز مرصع کا ہے۔

سوال نمبر2۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ناول نگاری کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

جواب:

ترقی پسند تحریک چوں کہ ایک واضح اشتراکی رجحان رکھتی تھی اس لیے اس تحریک کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا اس مین اشتراکیت ہی سے متاثر سیاسی ومعاشی اور اس طرح سماجی رجحانات کو ادب میں شعوری طور پر سمونے کی کوشش کی گئی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ناول میں بھی یہ موضوعات آئے۔اس سے ناول کو ایک طرح سے فائدہ بھی ہوا ہر نیا تجربہ، نئی سوچ، عمل اور نصب العین ادب میں اضافے ہی کا باعث بنتا ہے۔

ناول چونکہ بڑی منظم، مربوط، مرتب اور زندگی کو ایک بہت بڑی وحدت کی صورت پیش کرنے والی صنف ادب ہے اس لیے اس دور کے ناول نے جب سرمایہ داری کی ممانعت، استحصال کی مذمت اور دکھوں کے مارے عام لوگوں کے مسائل ومصائب سے ناطہ جوڑا تو اس کا رنگ بھی بدل گیا۔اگرچہ ترقی یافتہ ناول نے کبھی پردے کے پیچھے اور کبھی پردے کے سامنے اشتراکیت کا پرچار کیا۔لیکن پھر بھی اس دور کے ناول نے یہ چیز اچھی طرح باور کرادی کہ زمانے میں محبت کے علاوہ بھی کئی غم ہیں اور عام آدمی کی زندگی ان ہی غموں سے عبارت ہوتی ہے۔حسن وعشق کی تحیر خیز رومانی فضا جو آرزو کی دھند میں لپٹی رہتی ہے، زندگی میں آنے والا ایک لمحہ تو ہو سکتی ہے۔کل زندگی نہیں۔واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی میں کامیاب ترین آدمی بھی اگر اپنی روداد حیات ترتیب سے ترقم کر کے خود پڑھان شروع کرے تو وہ بھی بڑا ہی مایوس اور حد درجہ ادا ہوگا کہ یہی زندگی کا اصل رنگ اور اصل ہے۔اس سے آنکھ چرانا اور جان چھڑانا ممکن نہیں عام لوگ، عام دکھ، ظلم، حق تلفی، معاشی جبر زمین پر رینگتی ہوئی بے

کتاب اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

نو امخلوق یہ سارے تذکرے تو ملتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند ناولوں میں جو معاشرت پیش کی جاتی ہے وہ طبقہ بالا، طبقہ متوسط اور تعلیم یافتہ لوگوں کی معاشرت ہے جو ان تمام معاملات و مسائل پر فکر و تدبر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نچلے متوسط اور کلیتا نچلے طبقے کی معاشرت دکھائی نہیں دیتی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس دور کے ناول نگار اصولاً تو اشتراکی زاویہ نگار سے متاثر ہوں لیکن اشتراکیت جس زمینی ماحول کی تصویر کشی کرتے ہوئے مدد کو پہنچتے ہے اس سے واقعتاً آگاہ نہ ہوں ہمارے ناول نگار عمومی طور پر آسودہ متوسط طبقے کے صاف ستھرے کپڑے پہننے والے لوگ تھے۔

اس دور کے ناول نے اردو ناول کی ثروت خیزی میں کئی اعتبار سے اضافہ کیا۔ ''شکست'' (کرشن چندر اور ''آگ'' (عزیز احمد) اور ''تاحد نگاہ'' (ضیاء سرحدی) اس دور کی عمدہ مثالوں میں سے ہیں۔ ''طوائف'' اگرچہ اردو ناول میں پہلے بھی ایک موضوع اور مسئلے کے طور پر شامل ہو چکی تھی لیکن قاضی عبدالغفار کے ''لیلی کے خطوط'' نے طوائف کے عنوان کو ایک بالکل ہی نیا اور ماضی کے مقابلے میں توانا رنگ دے دیا ہے۔ نفسیاتی ناول کا چلن یا یوں کہہ لیں کہ ناول نگاری میں بڑے اہتمام کے ساتھ تحلیل نفسی اور بعض مقامات پر فرائیڈ کے تصورات سے اثر پذیری صاف دکھائی دیتی ہے۔ شبنم (عزیز احمد) ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی) اور تاحد نگاہ (ضیاء سرحدی) اس ضمن کا کامیاب مثالیں ہیں

اسی دور میں ترقی پسند تحریک کے ہنگامہ خیز رجحانات کے متوازی ناول نگاری بھی ہو رہی تھی۔ ان میں تاریخی ناول نگاری کا قوی رجحان بڑا واضح ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ اس دور کو سب سے زیادہ تاریخی ناول نگار میسر آئے تو بے جا نہ ہوگا ان میں رشید اختر ندوی قیسی رام پوری اور رئیس احمد جعفری نمایاں تر ہیں لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ ان تاریخی ناول میں وہ تمام تر خامیاں موجود ہیں جو کسی تاریخی ناول میں قیاس کی جا سکتی ہے پھر بھی یہ تاریخی ناول عام لوگوں میں بے حد مقبول رہے۔ اس دور میں معاشرتی اور اصلاحی ناول بھی لکھا جاتا رہا۔ خواجہ محمد شفیع، صالحہ عابد حسین، اے آر خاتون، اوپندناتھ اشک اور انہی کے ساتھ قیسی رام پوری، عادل رشیدہ اور رشید اختر ندوی معاشرتی اور اصلاحی ناول نگاری کرنے والوں میں نمایاں ہیں۔

محمد خوشتر

اردو ادب خاص طور سے اردو نثر علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک کے احسان سے بے حد گراں بار ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جو ادب کی خدمات انجام دی، وہ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے محنت کش انسانوں کو ادب کا ہیرو بنایا اور شہزادے کے سر سے تاج اتار کر مزدور کے سر پر سجا دیا۔ اس تحریک کے ذریعہ ہمارے ادب میں کھیتوں اور کھلیانوں کی سوندھی خوشبو بس گئی اور کسان و مزدور کا پسینہ اس کی طراوت کا سامان بن گیا۔ یہاں اس تحریک کو تاریخ عالم کے پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ کارل؟ مارکس مشہور جرمن مفکر تھا۔ اس نے محنت اور سرمایہ کے مسائل پر غور کیا اور اپنے افکار اپنی معرکہ آرا تصنیف ''سرمایہ'' میں پیش کیا۔ اس نے سرمایہ دار کو ظالم اور مزدور کو مظلوم قرار دیا، کیونکہ محنت کش یعنی مزدور کو سرمایہ دار پیداوار میں اس کا حصہ نہیں دیتا حالانکہ پیداوار میں اس کی محنت کو سرمایہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کارل مارکس کے نزدیک دولت کی یہ غیر مساوی یعنی نابرابر تقسیم ہی دنیا کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ لینن ایک بلند حوصلہ بیباک روسی رہنما تھا۔ اس نے محنت کشوں کی رہنمائی کا حق ادا کیا۔ اس زمانے میں روسی بادشاہ زار کی زیادتیاں انتہاء کو پہنچ کی تھیں۔ اس لیے وہاں کارل مارکس کے افکار کا گہرا اثر ہوا۔ لینن اور پلیخوف خاص طور پر مارکس سے متاثر ہوئے۔ آخر کار محنت کشوں نے متحد ہو کر ۱۹۱۷ء میں زار روسی کی قوت کو شکست دے دی اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ حکمراں جماعت کا نیا نام ''روسی کمیونسٹ پارٹی'' قرار پایا۔ اس انقلاب نے ساری دنیا پر یہ حقیقت روشن کر دی کہ مشقت کرنے والے فولادی ہاتھ اگر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو ظالموں کی مضبوط سے مضبوط حکومت بھی ان آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے آمرانہ رویہ نے دنیا بھر کے دانشوروں اور ادیبوں کو جو عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حساس اور نبض شناس ہوتے ہیں، یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب مظلوموں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

غور و فکر کا اسلوب۔

اس زمانے میں کچھ دردمند محبّ وطن ہندوستانی نوجوان لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ان میں چند اہم حضرات کے نام ہیں: سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور محمد دین تاثیر۔ انہوں نے آپس میں مل کر بار بار غور و فکر کیا کہ ان حالات میں ہندوستان کے ادیب اور دانشور کس طرح اپنا فرض پورا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے لندن میں ہم خیال دوستوں کو متحد کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے لندن میں ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس کی طرف سے ایک اعلان نامہ بھی شائع کیا گیا جس میں کہا گیا کہ اب پرانے خیالات کی جڑیں ہل رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ایسے میں ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ اس تبدیلی کو اپنی تحریروں کے ذریعہ اجاگر کریں اور ملک کو ترقی کے راستے پر لانے میں مدد دیں۔ ادب کو عوام کے نزدیک لائیں، اس میں حقیقت کا رنگ بھریں، اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ اعلان نامہ ہندوستان کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھیجا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ اسے ملک میں عام کریں۔ اسی سال سجاد ظہیر بھی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان لوٹ آئے جس سے انجمن کی سرگرمیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ الہ آباد یونیورسٹی میں احمد علی انگریزی کے لکچرر تھے۔ ان کا گھر انجمن کا دفتر بن گیا۔ ادھر حیدر آباد میں سبط حسن اور بنگال میں ہیرن مکھر جی نے ادب کی اس ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر راجندر نے ہندوستان اکادمی الہ آباد کی طرف سے اردو ہندی کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی جس میں ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کا تعارف کرایا گیا۔ اس کانفرنس میں پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی اور دوسرے بلند پایہ ادیب اور شاعر موجود تھے۔ مناسب سمجھا گیا کہ انجمن کے اعلان نامہ پر مختلف زبانوں کے عالموں اور ادیبوں کے دستخط کرائے جائیں۔ لوگوں نے بخوشی اس پر دستخط کر دیے جس سے انجمن کو تقویت حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن کی ایک کل ہند کانفرنس ہوئی۔ پریم چند نے خطب صدارت پیش کیا۔ مولانا

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

حسرت موہانی، کملا دیوی چٹوپادھیائے اور دیگر اہل علم نے تقریریں کیں۔ سجاد ظہیر انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کانفرنس میں انجمن کے دستور اساسی کو منظوری دی گئی۔ اس کے بعد ملک میں جا بجا انجمن کے جلسے اور کانفرنسیں ہوتی رہیں اور ترقی پسندوں کا یہ کارواں قدم سے قدم ملا کر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ وغیرہ اس تحریک کے زیر اثر افسانے اور ناول وغیرہ لکھتے رہے۔ اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض، اختر انصاری، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی اور پرویز مشاہدی وغیرہ انجمن ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے شاعری کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور، احتشام حسین، عزیز احمد، ممتاز حسین، جیسے نقادوں نے تنقیدی مضامین کے ذریعہ تحریک کے خدوخال نمایاں کرنے کی اہم ذمہ داری قبول کی۔ احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، فراق اور فیض تخلیق کار تھے مگر انہوں نے بھی تنقید نگاری کی طرف توجہ کی۔

ارتقائی شکل۔

اردو ناول اردو داستان کی ایک ارتقائی شکل ہے اور اسی کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے مگر ہمارے ادب پر مغرب کا بھی احسان ہے کہ ہمارے بزرگ ادیبوں کی نگاہیں ادھر اٹھیں اور انہوں نے مغربی ادب سے کسب فیض کیا۔ پریم چند کے زمانے میں ہی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس تحریک نے محنت کشوں کے مسائل کو ادب میں داخل کیا اور زندگی سے ادب کا رشتہ مستحکم کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر جو ناول لکھے گئے ان میں سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، قاضی عبدالغفار کا ''لیلیٰ کے خطوط''، عصمت چغتائی کا ''ٹیڑھی لکیر''، قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا''، کرشن چندر کا ''شکست'' اور عزیز احمد کا ''گریز'' قابل ذکر ہیں۔ عزیز احمد نے کرداروں کی ذہنی کشمکش کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی یہی انداز اختیار کیا۔ عصمت نے بھی تحلیل نفسی کا طریقہ اپنایا۔ انہوں نے متوسط مسلمان گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کے جنسی مسائل کا انتخاب کیا۔ کرشن چندر نے زیادہ جوش و خروش سے اشتراکی خیالات کا پرچار کیا۔ اسی دور میں عزیز احمد نے ایسی بلندی ایسی پستی، گریز اور ہوس جیسے کامیاب ناول لکھے۔ قرۃ العین حیدر نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے اردو ناول کو ایک نئی تکنیک ''شعور کی رو'' سے روشناس کیا۔ آگ کا دریا، میرے بھی صنم خانے، آخر شب کے ہم سفر، چاندنی بیگم، گردش رنگ چمن عینی آپا کے مقبول عوام و خواص ناول ہیں۔ اردو ناول کے نقد ؟ نظر سے موجودہ دور خاص طور پر زرخیز دور ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ئی سرحدوں کی دونوں طرف کشت و خون کا جو بازار گرم ہوا۔ اس نے فنکاروں کو ہلا کے رکھ دیا۔ ان کی تخلیقات میں اس خونیں داستان نے جگہ پائی۔ یہ دائرہ پھیلتا گیا اور عہد حاضر کے مسائل و مصائب ناول پر حاوی ہوتے گئے۔ انداز پیشکش بھی بدلا۔ انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں، ذہنی کشمکش رفتہ رفتہ اردو ناول میں زیادہ جگہ پاتی گئیں اور فن میں زیادہ گہرائی آتی گئی۔ اس دور میں عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں، اور ''باگھ''، شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی''، خدیجہ مستور کا ''آنگن'' حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول'' راجندر بیدی کا ''ایک چادر میلی سی'' بلونت سنگھ کا ''معمولی لڑکی''، قاضی عبدالستار کا ''شب گزیدہ''، مہندر ناتھ کا ''ارمانوں کی سیج'' جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں، اور ''روحی''، جیلانی بانو کا ''ایوان غزل'' انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ''، انتظار حسین کا ''بستی''، سلیم اختر کا ''ضبط کی دیوار'' جیسے معرکہ آرا ناول وجود میں آئے۔

کل ہند کانفرنس۔

ترقی پسند تحریک کی کل ہند کانفرنس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ اگر ان کو اس تحریک میں شامل کر لیا جائے تو آپ کے ناول کے بارے میں لکھنا ہی بہت سے صفحات کو رنگین کرنا ہے۔ الغرض پریم چند نے بہت ہی عمدہ اور صاف ستھرا ماحول کی عکاسی کے لیے ناول لکھے جو اصناف ناول میں عظیم کارنامہ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ آپ کے شہرت یافتہ ناولوں میں سے گؤ دان، میدان عمل، بازار حسن، گوشہ عافیت، چوگان ہستی ہیں۔ پریم چند نے فن ناول کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا اور اپنے ناول میں حقیقت نگاری اور دیہاتی زندگی پیش کر کے اردو ناول کے دامن کو وسعت دی۔ ترقی پسند تحریک کی ایک اہم ناول نگار عصمت چغتائی ہیں۔ عصمت نے کئی مشہور و کامیاب ناول تحریر کیا۔ عصمت کے ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نفسیات کی کشمکش کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ شروع سے عصمت کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے بہت سی کتابیں پڑھیں اور عملی زندگی میں انسانوں کی نفسیات پر غور کیا۔ خود ایک جگہ تحریر کرتی ہیں کہ لکھنے کے لیے میں نے دنیا کی عظیم ترین کتاب یعنی زندگی کو پڑھا ہے اور اسے بے حد دلچسپ و مؤثر پایا ہے۔ نفسیات کے علم سے عصمت نے کتنا فائدہ اٹھایا اور اپنے ناولوں میں کتنے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا، یہ دیکھنا ہو تو عصمت کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس میں کئی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ نظر آتا ہے۔

جنسی حقیقت نگاری عصمت کے ناولوں اور افسانوں کا دور۔

ان میں سے سب سے اہم کردار شمن ہے۔ یہ ناول شمن کی ذہنی الجھنوں اور ان الجھنوں سے پیدا ہونے والے نتائج کی داستان ہے۔ جنسی حقیقت نگاری عصمت کے ناولوں اور افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ انہوں نے جنسی مسائل کو عام طور پر موضوع بنایا اور بے باکی سے ان پر لکھا۔ ان پر بار بار فحاشی اور عریانی کے الزام میں مقدمے چلے، جنسی مسائل سے آگہی تو انہیں کم عمری میں ہی حاصل ہو گئی تھیں۔ ان کے بچپن میں محلے کی عورتیں دوپہر کو جمع ہو کر راز کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اس زمانے کے گھٹے ہوئے ماحول کی عورتیں جنس کے علاوہ اور کس موضوع پر گفتگو کر سکتی تھیں۔ لڑکیوں کو پاس پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی مگر نوعمر عصمت کو ان باتوں میں بہت دلچسپی تھی۔ پلنگ کے نیچے چھپ کر، کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر وہ یہ سب سن ہی لیتی تھیں۔ بچپن کے اس دور میں دوسری تربیت جو عصمت نے

کتاب اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

حاصل کی وہ بے باکی اور صاف گوئی کی تھی۔ جب ہمارے ملک میں جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثر سے کسی تجربے کے جڑ پکڑ لینے سے جھوٹی مذہبیت اور مصنوعی اخلاق کی گرفت ڈھیلی پڑی تو جنسی معاملات پر اظہار خیال کا رجحان عام ہوا۔ یہ بھی احساس ہوا کہ جنسی جذبات پر توجہ کیے بغیر انسانی ذہن کی گرہیں نہیں کھولی جاسکتیں۔ گویا نفسیات اور جنسیات کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ اس طرح اردو میں جنسی حقیقت نگاری کا آغاز ہوا۔ انگارے کے افسانہ نگاروں کے بعد وادیٔ پرخار میں قدم رکھنے والے ہمارے پہلے بڑے فنکار منٹو اور عصمت تھے۔ دونوں پر فحاشی کے الزام میں مقدمے چلائے گئے لیکن آخر کار اہل نظر کو اعتراف کرنا پڑا کہ دونوں حق بجانب تھے۔ عصمت کی زبان ان کے ناول کی دلکشی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جس طبقے کو انہوں نے اپنی تخلیقات کا خاص طور پر موضوع بنایا، اس طبقے کی زبان پر بھی انہیں پوری دسترس حاصل تھی۔ عورتوں کی زبان پر ان کی قدرت بے مثال ہے، یہ زبان انہوں نے اپنے خاندان سے اور کچھ علی گڑھ میں تعلیم کے دوران کالج کی لڑکیوں سے سیکھی۔ آخر صاف ستھری زبان، ایسی اجلی جیسے ابھی شبنم میں نہا کر نکلی ہو، خاص طور پر عورتوں کی زبان اس طرح ان کے دائرہ؟ اختیار میں آگئی کہ جس طرح چاہیں استعمال کریں اور اپنے فن کو چار چاند لگائیں۔

فن کا معراج اور ناول کی حقیقت۔

ان کے مشہور ناول ٹیڑھی لکیر پر کچھ تبصرہ حاضر خدمت ہے: ٹیڑھی لکیر کو عصمت کے فن کی معراج کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک کامیاب نفسیاتی ناول ہے جو ''ضدی'' کے تین سال بعد ۱۹۴۴ء میں تحریر کیا گیا۔ شمن اس کا مرکزی کردار ہے۔ حالات نے بے ڈھب اس لڑکی کو ایسے چرکے لگائے کہ اس کے مزاج میں ٹیڑھ پیدا ہوگئی اور اس کی فطرت مسخ ہوکر رہ گئی۔ شمن اپنے ماں باپ کی دسویں بیٹی ہے۔ اس کی پیدائش پر سب کو غم ہوتا ہے کہ بدبخت لڑکیوں نے بس یہی ایک گھر دیکھ لیا ہے۔ بے توجہی سے اس کی پرورش ہوتی ہے جس سے وہ محرومی اور تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ تخریبی عناصر اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ چیزوں کو توڑے پھوڑے اور جو سامنے آئے اسے پیٹ ڈالے۔ شمن کی بڑی بہن بیوہ ہوکر اپنی بیٹی نوری کے ساتھ باپ کے گھر آجاتی ہے۔ اس بچی کو شمن سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے شمن کے دل میں نفرت کے شدید جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسکول میں شمن کو ایک استانی مس چرن سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ہم جنسی کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کے بعد رسول فاطمہ اور نجمہ سے اس کی دوستی ہوتی ہے۔ یہ دونوں بھی اسی لعنت میں گرفتار ہیں۔ چھوت کا یہ مرض آخر شمن کو بھی لگ ہی جاتا ہے۔ آخر بلقیس اسے بتاتی ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں پر مرنا چاہیے تو وہ بلقیس کے بھائی رشید پر مرنے لگتی ہے مگر وہ ایک امیرزادی پر مرمٹتا ہے۔ ایک بار پھر شدید تنہائی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور شمن پھر نفرت کی آگ میں دہکنے لگتی ہے۔ کالج میں تعلیم کے دوران اس کی ملاقات پکی عمر کے رائے صاحب سے ہوتی ہے اور وہ ان سے اظہار محبت کر بیٹھتی ہے۔ اس قدم سے اس میں شرم کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ زمین میں سما جائے۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں اعجاز آتا ہے پھر افتخار آتا ہے جو ایک دن اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آکر اسے پھر محرومی کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔ آخر گمراہ ہوکر بہت سے لوگوں سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ آخر وہ ایک آئرش نوجوان رونی ٹیلر سے شادی کر لیتی ہے۔ نباہ اس سے بھی نہیں ہوتی اور تعلق منقطع ہوجاتا ہے مگر اب اس کی کوکھ آباد ہے۔ یہ احساس اس کی زندگی کو بدل ڈالتا ہے۔ زندگی کے یہ نشیب و فراز شمن کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اس کی نفسیات میں ایک ایسی کجی پیدا ہوجاتی ہے جو صرف آخر میں جاکر ہی دور ہوتی ہے۔

سجاد ظہیر۔

پھر ہم سجاد ظہیر کے مشہور زمانہ ناول 'لندن کی ایک رات' پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کی سعی کرتے ہیں۔ لندن کی ایک رات اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے ناول نگاری کی ایک نئی روایت شروع ہوتی ہے، جو مواد اور ہیئت دونوں ہی اعتبار سے ایک نیا فنی افق پیش کرتی ہے اور نئے امکانات کے لیے راہیں ہموار کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے زمانے کی فکری تبدیلی، ذہنی کشمکش اور سماجی و سیاسی اور معاشرتی انقلابات کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس ناول کے کردار وہ ہندوستانی طلبہ ہیں جو لندن میں زیر تعلیم ہیں۔ سجاد ظہیر نے ان طلبہ کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ان طلبہ کی نفسیاتی کیفیات کا بھی جائزہ لیا ہے جس میں اس زمانے کا نوجوان طبقہ گرفتار تھا۔ یہ تمام نوجوان حساس تھے اور اپنی کھلی آنکھوں سے مغربی تہذہب کے جگمگاتے ہوئے منظر اور سرمایہ دارانہ نظام کے تضادوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس خارجی ٹکراؤ کے دھماکے وہ اپنے اندر بھی محسوس کررہے تھے۔ ان محسوسات کو اس ناول نے فنکارانہ انداز میں اپنے اندر محفوظ کرلیا ہے۔ اس ناول کے کردار مختلف ذہنی سطح اور متضاد رجحانات والے نوجوان تھے۔ ان میں کوئی نعیم جیسا بے فکرا ہے جس کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں، کوئی اس ناسازگار ماحول میں بھی محبت کے نغمے گانے والا ہے۔ مس جین کی محبت میں سرشار اعظم، کوئی عارف جیسا نوجوان ہے جو اعلیٰ تعلیم اور بلند عہدہ پر فائز ہونے کا خواب دیکھ چکا ہے اور اس لیے حکومت کا مداح اور برطانوی جمہوریت کو ایک مثالی نظام سمجھنے والا گردانتا ہے، کوئی احسان کی طرح اشترا کی نظریات کے زیر اثر مارکس اور انجلز کو اپنا رہبر ماننے والا ہے تو کوئی لاؤ کی طرح ذہین وحساس ہوتے ہوئے بھی حالات کے تقاضوں کو سمجھنے سے عاری و قاصر۔ مختلف النوع ذہنی و جذباتی سطح رکھنے والے یہ نوجوان کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ نوجوان دراصل پورے ہندوستان کے نوجوانوں کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ وہ نوجوان جو قدیم و جدید قدروں کے دوراہے پر کھڑے فیصلہ نہیں کر پارہے ہیں کہ کدھر جائیں۔

جذباتی اور نفسیاتی فوقیت۔

الغرض صرف سوا سو صفحات پر مشتمل یہ ناول ایک مخصوص عہد کی تہہ در تہہ جذباتی اور نفسیاتی زندگی کی پیچیدگیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس دور کی ہندوستانی زندگی کے مختلف رجحانات و مسائل، تہذیبوں کی شکست و ریخت اور نوجوانوں کی ذہنی، جذباتی و نفسیاتی کیفیت کا اندازہ اس ناول سے لگایا جاسکتا ہے۔ سجاد

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

ظہیر نے تہذیب، جنس اور سیاست سے متعلق مختلف النوع موضوعات کو علمی نقط نظر سے دیکھا، پرکھا اور سنجیدہ انداز میں پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش بھی کی۔ ترقی پسند تحریک کی ایک اہم شخصیت راجندر سنگھ بیدی بھی تھے۔ انہوں نے بھی افسانے اور ناول تحریر کیے۔ پیش ہے ان کے مخصوص ومنفرد لب ولہجہ کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' پر ہلکی سی جھلک۔

ایک چادر میلی سی۔

''ایک چادر میلی سی'' میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ بہت مختصر اور سیدھی سادی ہے۔ تلوکا یکہ چلاتا ہے اور چودھری کے لیے بہلا پھسلا کر عورتوں کو لاتا ہے۔ ایک روز جاترن کا بھائی اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی رانو کی شادی اس کے چھوٹے بھائی منگل سے کر دی جاتی ہے۔ اس مختصر سی کہانی کا تعلق سکھ معاشرے کی رسم ''چادر ڈالنے'' سے ہے۔ یہ پنجاب میں شادی کی ایک رسم ہے۔ عورت پر چادر ڈال کر مرد اس کا شوہر بن جاتا ہے۔ اس مختصر سی گھریلو کہانی کے ضمن میں گناہ، نفرت، عورت، عیاشی، سماجی زنجیروں اور فرسودہ رسموں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ بیدی نے ان تمام باتوں کا ذکر اتنے فطری انداز میں کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنے حقیقی روپ میں نظر آتی ہیں۔ اس ناول میں بیان کیے گئے واقعات ہمیں اس لیے متاثر کرتے ہیں کہ ان میں کوئی فرضی داستان نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کو ناول نگار نے جیسا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے اسی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ زندگی کی کھردری حقیقتوں اور ڈھکے چھپے ناسوروں کے بیان نے ناول کی اثر آفرینی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح یہ ناول زندگی کا ایک مرقع ہے۔ یہ ناول اپنے اسلوب اور انداز بیان کی وجہ سے بھی کافی اہم مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں ان کا اشاراتی انداز کافی نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں، استعاروں اور اساطیری انداز نے اس ناول کی معنویت اور اثر آفرینی میں مزید اضافہ کر دیا ہے اس ناول کا جملہ اور تشبیہ واستعارہ نہایت ہی دلکشی پیش کرتا ہے۔

الغرض یہ ناول بیدی کی فنی بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ بیدی کی نظر بہت گہری ہے۔ واقعات کی معمولی جزئیات کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے۔ اس جزئیات نگاری نے ناول میں محاکات کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ پلاٹ کا تانا بانا ایک خاص ترتیب سے تیار کیا گیا ہے۔ واقعات اور کرداروں میں ایک خاص ربط ہے جس کی وجہ سے کہانی بڑے فطری انداز میں ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ اس طرح ناول اپنے فنی محاسن کی وجہ سے افسانوی ادب میں زندہ جاوید رہے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کئی اہم ناول لکھے گئے اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والوں نے اس صنف میں کئی اہم اور بڑے کارنامے انجام دیے اور کئی مصنفین نے اچھا وعمدہ ناول لکھ کر اردو ادب کی خدمات میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ اس صنف میں ان کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ترقی پسند تحریک کے بینر تلے لکھے گئے تمام ناولوں کی تفصیلات کو اس مختصر سے مضمون میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اختصار کے ساتھ پوری بات کہنے کی کوشش کی ضرور کی گئی ہے۔

سوال نمبر3۔ ''ابن الوقت'' کے حوالے سے مولوی نذیر احمد دہلوی کے اسلوب جائزہ لیجیے۔

جواب۔

ابن الوقت کا پس منظر

کسی بھی فن پارے کو اس کے پس منظر سے جدا کر کے سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ پس منظر سے مراد وہ مخصوص سیاسی،، سماجی اور معاشرتی حالات ہوتے ہیں۔ جن کے زیر اثر کوئی فن پارہ تخلیق پاتا ہے۔ اور ابن الوقت تو یوں بھی مخصوص حالات کے نتیجے میں لکھا گیا ناول ہے۔ سو ناول کی کہانی اور اس کے فنی وفکری تجزیے سے قبل ہم ان حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ ابن الوقت نذیر احمد کے سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی نظریات کا نچوڑ ہے۔ اس ناول کا تعلق قومی زندگی کے نہایت اہم مسائل اور رجحانات سے ہے۔ ابن الوقت کے قصے کا آغاز 1857ء کے ہنگامے سے ہوتا ہے۔ اور 1857ء کا انقلاب اس اعتبار سے برصغیر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے نہایت دوررس سیاسی ومعاشرتی نتائج مرتب ہوئے۔ اس ناول کے محرکات میں سے ایک تو گدر کے حالات ہی ں اور دوسرے تحریک علی گڑھ کا اثر ہے۔ اس ناول میں پوری علی گڑھ تحریک کو تجزیے اور تبصرے کا موضوع بنایا گیا ہے اور 1857ء سے ناول کے آغاز کا مقصد بھی علی گڑھ تحریک کے سیاسی پس منظر کو سامنے لانا ہے۔ یہ ناول اس وقت لکھا گیا جب سرسید کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور اس تحریک نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ سرسید کی تعلیمات کا حامی تھا اور اس تحریک کی سرگرمیوں کا ہر طرح سے ساتھ دیتا تھا۔ دوسرا اس تحریک کا شدید مخالف تھا اور سرسید کی تعلیمات کے باعث ان پر کفر والحاد کے فتوے لگاتا رہتا تھا۔ مولوی نذیر احمد نہ تو سرسید احمد خان کے مکمل تھے اور نہ ہی مکمل طور پر مخالف بقول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی:

''سرسید اور نذری احمد کے معاشرتی نظریات کا بنیادی فرق یہی ہے۔ دونوں اصلاح کی ضرورت کو سمجھتے تھے لیکن سرسید قوم کی قلب ماہیت کے خواہاں تھے اور اسے انگریز بنا دینے کے درپے رہے۔ نذیر احمد قومی خودی اور قومی کردار کو برقرار رکھتے ہوئے ایک جائز حد کے اندر اصلاح چاہتے تھے۔ سرسید احمد خان کو حد سے زیادہ جدت پسند کہا گیا ہے۔ لیکن نذیر احمد قدامت پرستی اور جدت پسندی کے درمیان ایک حد اعتدال کے قائل تھے۔ اور ابن الوقت میں اس قدامت وجدت کی آمیزش کے مناظر جگہ جگہ دکھائے۔

ابن الوقت کا پلاٹ وکردار:

کتاب اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

ابن الوقت کا پلاٹ نہایت سیدھا سادا اور سپاٹ ہے۔اسمیں کسی طرح کی پیچیدگی موجود نہیں۔ ذیل مٰن اس قصے کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔تا کہ پلاٹ کے متعلق کچھ اندازہ ہو سکے۔ابن الوقت دہلی کا ایک کھاتا پیتا نوجوان ہے مگر اس کا تھوڑا سا تلعق شاہی قلعے سے بھی ہے۔غدر کے ہنگامے میں ایک دن وہ ایک زخمی انگریز افسر نوبل صاحب کی جان بچاتا ہے اور اسے اپنے گھر مین پناہ دیتا ہے۔اس کے صلے میں ابن الوقت کو ایک معقلو جاگیر اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا عہدہ ملتا ہے۔نوبل صاحب کی باتوں کا اس پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ قوم کی اصلاح کی خاطر انگریزی کی طرز معاشرت اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔اپان آبائی مکان چھوڑ کر چھاؤنی میں جہاں انگریز آباد ہیں ایک کوٹھی کرائے پر لیتا ہے، اسے انگریزی سے آراستہ کرتا ہے اور اکیلا وہاں رہنے لگتا ہے۔اپنے عزیزوں، رشتہ داروں سے ناتا توڑ کر انگریزوں سے رشتہ ہے اور ان سے برابری سے ملتا ہے۔نوبل صاحب کے ہندوستان میں قیام تک دوسرے انگریز بھی اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں مگر نوبل صاحب کے ولایت واپس جانے کے بعد ان کے دل کی کدورت ظاہر ہونا شروع ہوتی ہے اور وہ ابن الوقت کے درپے ہو جاتے ہیں۔ابن الوقت کو چھاؤنی کی کوٹھی خالی کرنی پڑتی ہے کیونکہ انگریز یہ نہیں برداشت کر سکتے کہ کوئی دیسی آدمی ان کے علاقے میں ان کا ہم سر بن کر رہے۔قریب ہے کہ ابن الوقت معتوب ہو کر نوکری سے بھی نکالا جائے کہ اس کے دور کے ایک رشتہ دار خواجہ خضر بن کر آتے ہیں اور مباحثوں اور مناظرون کے ذریعہ ابن الوقت کو مغربی طرز زندگی ترک کرنے پر تیار کرتے ہیں تب اس کی نوکری بحال ہو جاتی ہے اور ابن الوقت اپنے رشتہ داروں سے جا ملتا ہے۔

(ماخوذ ابن الوقت مرتبہ سید سبط حسن)

ابن الوقت کے موضوع میں درج ذیل مباحث پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

(الف) علی گڑی تحریک کی تائید و مخالفت

(ب) مغربی و مشرقی تمدن کی بحث کے حوالے سے اصلاح معاشرت

(ج) مذہب و عقل کی بحث

ابن الوقت کے پلاٹ کے بارے میں مختلف نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(الف) ابن الوقت کے پلاٹ میں ناول نگار کے ذاتی تجربات کا دخل زیادہ ہے اور تخیل کا کم۔

(ب) ابن الوقت میں مرقع نگاری کا مقصد داستان طرازی یا ہیجان آفرینی نہیں بلکہ انسانی سیرت اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی ہے۔

(ج) ابن الوقت کے پلاٹ میں پلاٹ بافی کی کوئی شعوری کوشش موجود نہیں۔

(د) ابن الوقت میں مذہب اور سیاست کی طویل بحثوں نے قصے کی ترتیب اور ہیئت کو مجروح کیا ہے۔

ابن الوقت کے پلاٹ سے متعلق تفصیلی بحث مختلف کتب میں درج ہے۔جن کی تفصیل آخر میں دی گئی ہے۔آپ ان کا بغور مطالعہ کریں تا کہ اس بحث کو سمجھ سکیں۔

ابن الوقت کی کردار نگاری:

ایک معیاری ناول میں یوں تو بہت سی باتوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔مگر تین باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ان میں پہلی پلاٹ، دوسری کردار نگاری اور تیسری زبان یا اسلوب ہے۔کردار نگاری کے حوالے سے ابن الوقت کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یوں تو اس میں متعدد کردار موجود ہیں مگر مرکزی کردار ابن الوقت ہی ہے۔ناقدین ادب نے کبھی ابن الوقت کو سرسید سے اور کبھی خود نذیر احمد سے مشابہ قرار دیا ہے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ابن الوقت کے کردار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

الف) اس کے کردار میں تبدیلی ایک تدریجی ارتقائی عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔یہ زندہ متحرک اور نمو پذیر کردار ہے۔

ب) اس کے کردار میں نفسیاتی کیفیات کی ایسی مصوری موجود ہے کہ اس کی تمام حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ج) ابن الوقت نذیر احمد کا معتوب کردار نہیں بلکہ اس کے کردار میں نذیر احمد کے بیشتر پسندیدہ اور ذاتی اوصاف موجود ہیں۔

د) نذیر احمد کا ابن الوقت روایتی ابن الوقتوں سے بالکل مختلف ہے۔اس میں حق گوئی اصول پسندی، فرض شناسی اور دیگر متعدد اوصاف موجود ہیں۔

ر) وہ مغربی طرز زندگی کا حامی ہے اور مغرب کی بنیاد تقلید کی بجائے عقل اور سائنس پر رکھتا ہے۔

ابن الوقت کے ضمنی کرداروں میں نوبل، شارپ، جان نثار اور حجۃ الاسلام قابل ذکر ہیں۔ان میں سے ہر کردار اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ سب کردار بقول سید سبط حسن

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

ابن الوقت کے کردار کی تعمیل وتشکیل میں اس کے معاون بن کر سامنے آتے ہیں۔ابن الوقت میں مولوی نذیر احمد اپنے دیگر ناولوں کے برعکس ایک کامیاب کردار نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ان کے اکثر کردار اسم با مسمی ہوتے ہیں مگر ابن الوقت ایک متحرک کردار ہے۔

ابن الوقت کی زبان واسلوب: مولوی نذری احمد ایک مقصدی ناول نگار ہیں انہوں نے زیادہ تر مذہبی معاشرتی اور مذہبی مسائل پر ناول لکھے ہیں۔اس قدر متنوع مسائل پر لکھنے کے باوجود وشاید ہی کسی خیال کے اظہار میں انہیں کوئی تشنگی محسوس ہوتی ہو اس کی بنیادی وجہ اس کا زور بیان ہے۔ان کے اسلوب کی اس خوبی کا اعتراف اکثر ناقدین نے کیا ہے۔اپنے ایک خط میں انہوں نے اس بات کا ذکر یوں کیا ہے۔

(الف) میری زبان میں خدا نے اتنی قوت دی ہے کہ سمجھا دینے اور ذہن نشین کر دینے کا دعوی رکھتا ہوں۔(موعظہ حسنہ ص 139)

ناقدین ادب نے نذیر احمد کے زبان واسلوب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ نمبر وار ذیل میں میں درج ہے۔

الف) نذری احمد کے بیانیہ اسلوب میں میر امن کے اسلوب کی بعض بنیادی خصوصیات موجود ہیں۔

ب) روزمرہ اور محاورے کے استعمال پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل ہے۔

ج) زبان کے معاملے میں انہوں نے اشرافی روایات سے بغاوت کر کے ٹھیٹھ عوامی بول چال کو رواج دیا۔

د) نذیر احمد کو ہر طبقے اور بالخصوص نسواں کے مخصوص الفاظ ومحاورات واصطلاح پر خاص مہارت حاصل ہے۔

ر) مذہبی موضوعات میں نذیر احمد کے عامیانہ محاورات والفاظ اصول بلاغت کے خلاف ہیں۔

س) نذیر احمد کی لفاظی نے اکثر مقامات پر طوالت اور تکرار کو جنم دیا ہے۔

ق) ان کی بیشتر تحریروں میں گفتگو کا انداز اور براہ راست تخاطب کا پیرایہ موجود ہے۔

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

نمونہ متن:

''دنیا میں شاید قوم کے رفارم (اصلاح ۹ سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں ہوسکتا سو ابھی یہاں پوری رفارم کا کیا فائدہ ہے پوری رفارم تو وہ تھی جس کا بیڑا ہمارے پیغمبر صاحب نے اٹھایا تھا۔مبعوث ہوئے عرب میں جن سے بدتر اس وقت روئے زمین پر کوئی قوم نہ تھی۔اس رفارم کے مقابلے میں کیا بیچارہ ابن الوقت اور کیا اس کی رفارم وہی مثل ہے کیا پدری اور کیا پدری کا شور ہا۔اس کی اتنی ہی بساط تھی کہ اس کو آپ سوجھی اور نوبل صاحب نے بھی سمجھا دی کہ انگریزی عملداری میں مسلمان بگڑتے چلے جاتے ہیں۔یہ تھا ایک واقعہ بدیہی۔سب کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ انگریزی عملداری میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔رعیت ہو کر بادشاہ سے نفرت،محکوم رو کر حاکم سے گریز یہاں تک ابن الوقت کی رائے نہایت درست تھی۔اب اس نے قومی ہمدردی اور سرکاری خیر خواہی کے تقاضے سے چاہا کہ مسلمانوں کی وحشت اور اجنبیت کو دور کر کے حاکم ومحکوم میں ارتباط اختلاط پیدا کرادوں۔بس یہ ہے خلاصہ ابن الوقت کی رفارم کا''

حجۃ الاسلام:''بحث مت کرو میں تو مذہب کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کا سخت مخالفت ہوں اور میں نے شروع ہی میں تم سے کہہ دیا تھا کہ دین حجت اور تکرار سے حاصل ہونے والی چیز نہیں۔دین دوا ہے بیماری کی تسلی ہے۔خریدار کی بشارت ہے امیدوار کی۔نجات ہے گنہگار کی یعنی عنایت ہے پروردگار کی جو کچھ میں نے تم سے کہا ہرگز از راہ بحث نہیں کہا بلکہ یہ تقاضائے محبت کہ تم کو اپنی سمجھ کے مطابق ایک تدبیر بتائی کہ اپنے دل میں صدق نیت کے ساتھ غور کرو تو عجب نہیں خلجان باقی نہ رہے اور قیامت اور بازخواست قیامت کی یاد کے نکالنے کی جو تم کہی یہ تو تمام رحمتیں اسی دن کے لیے ہیں اگر قیامت اور قیامت کی بازخواست نہ ہوتی تو کیوں دین ڈھونڈتے اور کس لیے مذہب کی تلاش کرتے۔بڑی مشکل تو یہی ہے کہ مرنے سے بھی آدمی کا پنڈ نہیں چھوٹا یہ زندگی دنیا تو چند روز ہے بھلی طرح بھی گزر جائے گی اور بری طرح بھی گزر جائے گی۔پہاڑ سی زندگی تو وہ ہے مرنے سے شروع ہوگی گویا از سر نو پیدا ہوئے اور جس کی اصلاح دین کا مقصود واصلی ہے''۔ابن الوقت''خدا کے ہونے پر تو بھلا آپ نے ایک دلیل قائم کی بھی۔ہر چند میرے دل کو اس سے نہیں ہوتی اور میں اس وقت تک یہی سمجھتا ہوں کہ لوگ ہو رہے ہیں اسباب کے خوگر،جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھئے سب ہی سب نظر آرہے ہیں۔اس وجہ سے انہوں نے ذہن میں تعمیم کر لی ہے کہ ہر واقعہ کے لیے سبب کا ضرور ہے اور سبب نہیں پاتے تو جھٹ سے خدا کے قائل ہو جاتے ہیں۔مگر میں سننا چاہتا ہوں کہ قیامت اور خواست قیامت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے''

حجۃ الاسلام:

''میں نہیں جانتا کہ خدا کے لیے تم کس طرح کا ثبوت چاہتے ہو؟اگر یہ مطلب ہے کہ آنکھ سے دیکھوں یا ہاتھ سے ٹٹولوں تو میں کیا کوئی بھی دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ تم کو خدا کا دیدار دکھا دے گا۔مگر یہ فرماؤ کہ ثبوت دلیل سارے اذغان حاصل کرنے کے ذریعے ہیں اذعان مرئیات اور ملموسات ہی میں منحصر ہے؟ہرگز نہیں ہر

شخص اپنے وجدانیات کا اذعان کرتا ہے۔ حالانکہ امور وجدانی نہ مرئی ہیں نہ ملموس اور تعمیم پر جو تم نے اعتراض کیا، کیونکہ میں سمجھوں کہ حقیقت میں تم کو شک ہے، جبکہ میں دیکھتا ہوں اور تم کہتے کچھ ہو اور کرتے کچھ ہو''

''ابن الوقت: ''خیر آپ کی عقل ایسے ڈھکوسلوں کو قبول کرتی ہوگی کہیے تو آپ کی خاطر سے جھوٹ بول دوں۔ ورنہ میں تو نہیں سمجھتا کہ جب تک مسلمان تقدیر اور شیطان اور اسی طرح دوسری لغویات کے معتقد رہیں گے ان کو کبھی فلاح ہو''

حجۃ: ملا جی گالیوں کی سہی نہیں۔ خلط مبحث مت کرو۔ مقرر کر کے ایک ایک بات کہو تو جواب دیا جائے''

ابن الوقت: آپ ہی انصاف سے کہئے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمت نہیں کیا۔ سب سے بڑے دیندار، ورثۃ الانبیاء دین کے محافظ، دین کے حامی، دین کے حامی، دین کے رواج دینے والے، مولوی مشائخ اور یہ تو ہمارے گھر کا کام ہے۔ ساری حقیقت آپ کو بھی معلوم ہے۔ مجھ کو بھی ہے۔ مرد و زن ملا کر ڈیڑھ سو پونے دو سو آدمیوں کی گزر کس چیز پر تھی؟ خیر خیرات پر جس کو دیکھو تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے''۔

حجۃ:

شخصیات سے بحث کرنے میں تو غیبت ہوتی ہے۔ اور کسی کی نیت کا حال کیا معلوم مگر تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمت کر دیا۔ دنیا میں مسلمانوں نے کیا نہیں کیا؟ ملک گیریاں کیں، ملک داریاں کیں، خشکی اور تری کے سفر کیے مجارتیں، صناعیاں کیں، دستکاریاں کیں، علم تحصیل کیے۔ ایجادیں کیں۔ غرض دنیا کے سبھی کام کیے، اور ایسے کیے کہ ان کے زمانے میں دوسروں سے نہیں ہو سکتے تھے اور اب بھی زمینداری، کاشتکاری، دستکاری، تھوڑی بہت تجارت، برا بھلا پڑھنا لکھنا، نوکری چاکر سبھی کچھ کرتے ہیں اور کرتے نہیں تو کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟ یہ بات دوسری ہے جو چاہیے نہیں کرتے یا کرنے میں کمی کرتے ہیں۔ مگر اس کے اسباب دوسرے ہیں نہ یہ عقیدہ تقدیر نے ان کو کاہل کر دیا ہے۔ ہندو، عیسائی یہودی کون ہے جو تقدیر کا قائل نہیں۔ تو اگر مجرد تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا باعث ہوتا تو یہ سب کاہل ہوتے حالانکہ بالتخصیص مسلمانوں ہی کو ملزم ٹھہراتے ہو اور چونکہ تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہیں تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا سبب کیوں ہونے لگا۔ بلکہ وافر مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تقدیر پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے ثابت قدمی اور استقلال مزاجی کے ساتھ کوشش کی اور آخر کامیاب ہوئے''

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

ڈاکٹر تاثیر:

اردو میں مولوی نذیر احمد کا نام ان کے ناولوں کے سبب زندہ رہے گا اور نقاد تعجب کیا کریں گے کہ کس طرح ایک عربی فارسی کا عالم، مولوی قسم کا آدمی، انگریزی ناولوں سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی ایسے ناول لکھ گیا جو گفتگو، کردار اور سماج کی حالت بیان کرنے میں اس قدر کامیاب ہیں کہ شاید: ان سے بہتر اور کوئی ناول نہیں۔

پروفیسر احتشام حسین:

بہت سے نقاد نذیر احمد ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے۔ میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انہیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں۔ مراۃ العروس، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا ایامی اور ابن الوقت ہر ایک میں گہرے سماجی حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ ہر ایک میں انیسویں صدی کے وسطی دور کا کوئی نہ کوئی اہم مسئلہ بنیادی مقام رکھتا ہے۔ ہر ایک میں چند کردار بعض مسائل کے نمائندے بن کر زندہ اور متحرک شکل میں سامنے آتے ہیں۔

سوال نمبر 4۔ ''فردوس بریں'' کا فکری و فنی جائزہ اس طرح لیجیے کہ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اس کا مقام متعین ہو سکے۔

جواب:

عبدالحلیم شرر نے اس ناول میں فرقہ باطنیہ کی مختصر تاریخ، ان کے عقائد ان کی سازشوں کا احوال اور طریقہ کار اور ان کی تباہی کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ ناول فرقہ باطنیہ کے عروج کے زمانہ آخر کے احوال پر مبنی ہے۔ فردوس بریں کا قصہ مختصراً یوں ہے کہ شہر آمل کا ایک نوجوان حسین، اپنی منگیتر زمرد کے ساتھ حج کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوا۔ دونوں کا ارادہ تھا کہ وہ قزوین پہنچ کر عقد نکاح کر لیں گے۔ جب وہ طالقان کے پہاڑوں میں پہنچے تو زمرد نے اصرار کیا کہ وہ اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جائے گی جو ان پہاڑوں میں گھری ایک وادی میں پریوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دونوں موسیٰ کی قبر ڈھونڈتے ہوئے اوادی میں جا نکلے انہوں نے قبر ڈھونڈ لی اور فاتحہ پڑھی۔ اسی دوران شام ڈھل چکی تھی وہ دونوں ابھی موسیٰ کی قبر پر ہی موجود تھے۔ کہ اچانک پریوں کا ایک غول نمودار ہوا جسے دیکھ کر دونوں بے ہوش ہو گئے۔ حسین کو ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی لیکن زمرد وہاں سے غائب تھی۔ اس نے اسے وہاں ہر طرف تلاش کیا مگر کہیں نہ پایا۔ موسیٰ کی قبر پر نظر پڑی تو اسے اس میں کچھ تبدیلی نظر آئی اور ساتھ ہی کتبے پر موسیٰ کے ساتھ زمرد کا نام بھی لکھا نظر آیا۔ اس نے جان لیا کہ زمرد مر چکی ہے اور موسیٰ کے ساتھ قبر میں دفن کر دی گئی

ہے۔زمرد کی ناگہانی موت اس پرغم کا پہاڑ بن کرٹوٹی۔اور وہ اس کی قبر کا مجاور بن کر وہیں رہنے لگا۔

منظر نامہ۔ اسی حالت میں اسے چھ ماہ گذر گئے وہ اس بات کا منتظر رہا کہ کہیں پھر سے پریوں کا غول دکھائی دے اور پریاں اسے بھی زمرد کے پاس پہنچادیں۔لیکن اس کے یہ انتظار بے سود رہا۔آخر ایک دن زمرد کی قبر پر اسے ایک خط پڑا ملا جو زمرد کی طرف سے تھا اور اس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے وطن واپس جائے اور عزیز رشتہ داروں کو زمرد کی معصومیت اور موت کی خبر دے اور اس کی پاکیدامنی کا یقین دلائے کیوں کہ ان کے الزامات اسے دوسری دنیا میں بے چین رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ زمرد نے لکھا کہ وہ جن جگہ ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے وہ پریوں کی سیر گاہ لیکن چونکہ ابھی حسین کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے۔اس لئے پریاں اس سے اپنی سیر گاہ خالی کرانے کے لئے اس قتل بھی نہیں کرسکتیں انہوں نے اس طرف کو آنا چھوڑ دیا ہے۔حسین یہ خط پڑھ کر بھی وہاں قیام پذیر رہا۔ایک ماہ بعد اسے دوسرا خط ملا جس میں زمرد نے اس سے شکایت کی تھی اور اسے ہدایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر وہ اس سے ملاقات کا آرزومند ہے تو اس کے لئے بڑی سخت آزمائشوں سے گذرنا ہوگا۔اس کی قبر کا مجاور بن کر بیٹھنے سے وہ اپنی مراد نہیں پاسکتا بلکہ اس کے لیے اسے کوہ جودی کے اس مقدس غار میں جا کر چلہ کشی کرنی چاہیے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ریاضیت کی تھی۔اس کے بعد وہ ''شہر خلیل'' کے تہہ خانوں میں جا کر چلہ کشی کرے جہاں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے جنازے رکھے ہوئے ہیں اور پھر شہر حلب میں پہنچ کر شیخ علی وجودی کے مریدوں میں شامل ہو کر ان کا حکم بجالائے۔

کاشان اکیڈمی

فنان الشیخ کا مرتبہ۔

حسین نے زمرد کے اس خط پر عمل کیا اور ان تمام مراحل سے گزر کر شیخ علی وجودی کے پاس جا پہنچا۔وہ گیارہ ماہ شیخ کی خدمت میں رہا جس نے اس فرقہ باطنیہ کا مکمل پیروکار اور معتقد بنا دیا۔جب وہ اپنے شیخ کی اطاعت کے ذریعے فنافی الشیخ کے مرتبہ پر پہنچ گیا تو اسے اپنے چچا اور اس زمانے کے مشہور عالم باعمل شیخ نجم الدین نیشاپوری کو قتل کرنے کا حکم ملا۔اس مذموم کام کی تکمیل پر حسین کو بطور انعام فرقہ باطنیہ کی جنت (فردوس بریں) کی سیر کرائی گئی جہاں وہ زمرد سے بھی ملا۔

0334-5504551

فرقہ باطنیہ و دیگر احوال۔

فرقہ باطنیہ کی جنت کی سیر کے بعد جب وہ دوبارہ حلب پہنچا تو اسے امام نصر بن احمد کے قتل کا حکم ملا۔اس نے اپنے شیخ کے کہنے پر اس جرم قبیح کا ارتکاب کیا اور پھر زمرد سے ملنے کی آرزو کی۔شیخ علی وجودی کی سفارش لے کر وہ ایک بار پھر قلعہ الموت پہنچا جہاں وہ زمرد سے فردوس بریں میں ملاقات سے پہلے باطنیوں کے امام ومقتدا سے ملا تھا۔اس مرتبہ حسین کی بیتابی و بے قراری نے باطنیوں کے امام رکن الدین خورشاہ کو برہم کر دیا اور اسے قلعہ الموت سے باہر نکال دیا گیا۔حسین مایوسی کے عالم میں پھر زمرد کی قبر پر جا بیٹھا۔ایک ماہ بعد اسے وہاں زمرد کے دو خط ملے ایک خط اس کے نام تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ دوسرا خط کھولے بغیر تاتاریوں کی شہزادی بلغان خاتون تک پہنچائے۔بلغان خاتون چنگیز خان کے بیٹے چغتائی خان کی بیٹی تھی جسے باطنیوں نے قتل کرڈالا تھا۔حسین زمرد کا خط لے کر بلغان خاتون کے ہاں قراقرم جا پہنچا،اور خط بلغان خاتون کو پہنچادیا۔زمرد نے خط میں لکھا تھا کہ اس کے باپ کا قاتل قلعہ الموت میں باطنیوں کی فردوس بریں میں عیش کررہا ہے۔وہ اگر زمرد کی ہدایات کے مطابق عمل کرے تو اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکتی ہے۔شاہزادی بلغان اپنے چچازاد منقو خان جو تاتاریوں کا خاقان تھا اسے اجازات لے کر پانچ سو سواروں کے ساتھ قلعہ الموت کو روانہ ہوئی اور اپنے بھتیجے ہلاکو خان کو پیغام بھیج کر مدد کیلئے پہنچنے کو کہا۔رود بادالموت میں پہنچ کر شہزادی اپنے تین آدمیوں کے ہمراہ حسین کی رہنمائی میں زمرد کی قبر پر گئی جہاں اسے پہلے خط کی ہدایات کے مطابق زمرد ایک دوسرا خط ملا جس میں فرقہ باطنیہ کی جنت تک پہنچنے کا راستہ بتلایا گیا تھا۔شہزادی اس خط کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے حسین کے ساتھ جنت میں جا پہنچی زمراد اور ان کی منتظر تھی۔شہزادی اس خط کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے حسین کے ساتھ جنت میں جاپہنچی زمرد ان کی منتظر تھی۔شہزادی فردوس بریں کے رستے میں مختلف مقامات سے اپنے تین ساتھیوں کو واپس بھیجتی رہی تھی تا کہ وہ باقی سپاہیوں کو لے کر ان کے پیچھے پہنچ سکیں۔

0300-5752486

مصنوعی جنت۔

زمرد نے انہیں فرقہ باطنیہ کے تمام فریب اور ان کی مصنوعی جنت کے رازوں سے آگاہ کیا حسین یہ سب جان کر حیران رہ گیا۔اسی دوران ہلاکر خان بھی اپنے ساتھ ایک بڑا لشکر لے کر شہزادی کے سپاہیوں سے آملا تاتاریوں کے ٹڈی دل سے قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ہلاکو خان اپنے پانچ ہزار سپاہیوں سے آملا تاتاریوں کے ٹڈی دل نے قلعہ کو چاروں طرف گھیر لیا اور ہلاکو خان اپنے پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ باطنیوں کی جنت میں داخل ہوا۔زمرد کی رہنمائی میں وہ محل سرا کے راستے قلعہ الموت میں پہنچ گئے قلعہ میں عید کا جشن منایا جارہا تھا۔تاتاری ان پر عذاب الہی بن کر نازل ہوئے اور نا کا حملہ استقدار اچانک تھا کہ قلعہ مسمار کردیئے گئے ان کا امام ومقتدا رکن الدین خورشاہ کو گرفتار کر کے بحر خزر کے پار ترکستان کے علاقے میں بھجوا دیا گیا اور اس طرح یہ فتنہ عظیم اپنے انجام کو پہنچا۔زمرد اور حسین کی

شادی ہوگئی اور وہ دونوں فریضہ حج ادا کرنے کے بعد اپنے وطن میں کچھ وقت گذارنے کے بعد بلغان خاتون کے پاس قراقرم چلے گئے۔

فردوس بریں کا پلاٹ:

آغاز:

پہلا باب جس کا عنوان ''پریوں کا غول'' ہے اس میں ایک ہیبتناک پرخطر وادی سے دو اجنبی مسافر گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شرر نے اس مقام کی خوفناکی کا منظر نہایت عمدگی سے کھینچا ہے اور ناول کے آغاز ہی میں دو اجنبی مسافروں جن میں سے ایک نوجوان لڑکا ہے۔ اور دوسری لڑکی کے بارے میں قاری کا تجسس بیدار ہونے لگتا ہے۔ قاری ان کے باہم تعلق اور مقصد سفر کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اس نوعمر جوڑے کی آپس میں گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں گھر سے نکلے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا ہے اور نوجوان لڑکی اگرچہ حج کی نیت سے اپنے منگیتر کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئی ہے لیکن چونکہ اپنے گھر والوں سے چوری چھپے نکل کھڑی ہوئی ہے لہذا بے چین اور مضطرب ہے۔ اس کا یہ احساس کہ اس کے عزیز رشتے دار اور اہل شہر اس کے بارے میں کیا کیا باتیں کرتے ہوں گے اسے پریشان رکھتا ہے۔ ان کی باہم گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قزوین پہنچ کر عقد نکاح کر لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

زمان ہجر:

دوسرے باب کا عنوان ''پیاری زمرد تو کہاں ہے'' ہے۔ یہ عنوان قاری کے ذہن میں ہی ایک سوال بن کر ابھرتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ''بے ہوشی'' سے ہوش میں آنے پر حسین اپنے آپ کو وہاں تنہا پاتا ہے اور زمرد غائب ہوتی ہے حسین اسے ہر طرف تلاش کرتا ہے مگر کہیں نہیں پاتا اچانک اس کی نظر موسی کی قبر پر پڑتی ہے تو وہ اس میں تبدیلی محسوس کرتا ہے اور قبر کی لوح پر موسی کے ساتھ زمرد کا نام لکھا ہوا دیکھ کر اس کے دل پر قیامت گزر جاتی ہے اس موقع پر قاری بھی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا واقعی زمرد مر چکی ہے۔ اور اپنے بھائی کی قبر میں دفن کر دی گئی ہے۔

امید وصل:

تیسرے باب کا عنوان ''ملاء اعلی کا سفر'' ہے۔ یہ عنوان دیکھ کر قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ حسین کی آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں۔ قاری کا تجسس عروج پر ہوتا ہے۔ کیا حسین نے اپنے مرشد و مربی نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دیا؟ ملاء اعلی کا سفر کیسا ہے؟ جلد ہی ان سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

ایام نامرادی:

پانچواں باب ''پھر وہی عالم عناصر'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں حسین اپنی دکھوں کی دنیا میں واپس لوٹ آتا ہے۔ اس کے دل میں زمرد کی تمنا پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو چکی ہے۔ وہ اس تک دربارہ پہنچنا چاہتا ہے اور اس لئے اپنے شیخ کے احکام کی بے دریغ تعمیل کرتا ہے۔ چھٹے باب کا عنوان ''مرد و ازلی'' ہے۔ مرد ازلی حسین ہی ہو سکتا ہے۔ کیا وہ دوبارہ جنت میں داخل ہونے میں ناکام رہا؟ قاری اپنی مشکوک و شبہات میں چھٹے باب کے اوراق الٹتا ہے۔

تاتاری انتقام:

حسین زمرد کی ہدایات کے مطابق بلقان خاتون کے پاس جا پہنچتا ہے اور اسے زمرد کا خط پیش کر کے تمام حالات سچ سچ بیان کرتا ہے۔ بلقان خاتون زمرد کا خط پڑھتی ہے جس میں زمرد نے فرقہ باطنیہ کے دجل و فریب کا پردہ چاک کیا ہوتا ہے۔ ساتویں باب عنوان ''بلقان خاتون کا سفر'' ہے۔ تاتاری شہزادی اپنے چچازاد بھائی منقو خان جو تاتاریوں کا خاقان اعظم ہے کے پاس جاتی ہے اور اسے خط دکھا کر اس مہم پر روانگی کی اجازت طلب کرتی ہے۔ منقو خان اس مہم پر بلقان خاتون کے روانہ ہونے کی مخالفت کرتا ہے مگر بلقان خاتون اسے قائل کر لیتی ہے۔

انجام:

ناول کا آٹھواں باب ''افشائے راز'' قاری اور حسین کے ذہن میں اٹھنے والے تمام سوالوں کا جواب ہے۔ دونوں ایک طویل اور صبر آزما سفر کے بعد منزل تک آ پہنچے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے باطنیوں کے دجل و فریب کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ نویں باب میں بلقان خاتون کا ابن عم ہلاکو خان اپنی سپاہ کے ساتھ پہنچ جاتا ہے اور ان تین سپاہیوں کی رہنمائی میں جنہیں بلغان خاتون نے تین مختلف مقامات سے واپس بھیجا تھا باطنیوں کی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور باطنیوں کا قلع قمع کر کے ان کی جنت اور تمام قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

کردار نگاری:

کاشان اکیڈمی
0334-5504551
0300-5752486

فردوس بریں کے بڑے کرداروں میں حسین زمرد اور شیخ علی وجودی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ حسین اس ناول کا ہیرو۔ اور مرکزی کردار ہے اس سے ہماری پہلی ملاقات کوہ الرز کی ایک وادی میں ہوئی ہے۔

زمرد: زمرد ایک اعلیٰ خاندان کی شریف اور با کردار مشرقی دوشیزہ ہے وہ کہانی کے آغاز ہی سے اس احساس ندامت سے مغلوب ہے کہ اس کے اس طرح ایک غیر محرم کے ساتھ چلے آنے پر لوگ اس پر کیا کیا الزامات دھرتے ہوئے گے۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہے اور ابتداء ہی سے یہ سوچ کر گھر سے نکلی ہے کہ اپنے مرحوم بھائی کی قبر پر جائے گی۔

شیخ علی وجودی:

فردوس بریں کا تیسرا اہم ترین کردار شیخ علی وجودی کا ہے یہ پراسرار شخص ان تمام صفات کا حامل ہے جو باطنیہ جیسے خفیہ اور دہشتناک مذہب کی پیشوائی کے لئے درکار ہیں۔ وہ اپنے زہد و اتقار روحانیت اور لامحدود تصرفات کا مظاہرہ کر کے حسین کے دل و دماغ پر اس طرح قابض ہو جاتا ہے کہ حسین اس کے اشارو پر ایک معمول کی طرح ناچتا ہے اور بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

بلقان خاتون:

ایک تاتاری شہزادی ایک جرات مند با عمل اور مردانہ صفات کی حامل خاتون ہے جو اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینا چاہتی ہے اور یہ کام کسی دوسرے کے سپرد کرنے کی بجائے خود صرف پانچ سو سواروں کے ساتھ حسین کی رہنمائی میں قلعہ الموت تک جا پہنچی ہے اور پھر تن تنہا اپنے ساتھیوں کو باہر چھوڑ کر باطنیوں کی جنت میں چلی جاتی ہے۔

فردوس بریں کے مکالمے: فنی لحاظ سے اس ناول کے مکالمے بہت عمدہ ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری فردوس بریں کے مکالموں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ فردوس بریں کے مکالمے فنی اعتبار سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہ پلاٹ کے ارتقاء ماحول سازی اور کرداروں کی شخصیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا اہم حصہ لے رہے ہیں۔ بعض عاشقانہ مکالمے قدرے کمزور ہیں۔ لیکن دیگر مکالمے کرداروں کی نفسیات اور شخصیت سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔

منظر نگاری:

فردوس بریں کی منظر نگاری عبدالحلیم شرر کے کمال فن کا ثبوت ہے۔ اس نے فردوس بریں کا احوال بیان کرتے ہوئے باطنیوں کی بنائی ہوئی جنت کی خوب مرقع کشی کی ہے۔

فردوس بریں کی ادبی حیثیت:

فردوس بریں کو شرر کے تاریخی ناولوں میں ایک شاہکار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سہیل بخاری اپنی کتاب ''اردو ناول نگاری'' میں ''فردوس بریں'' کے بارے میں لکھتے ہیں ''شرر کی تصنیفات کی مقدار بہت زیادہ ہے اور اسی اعتبار سے ان کے ناول بھی کثیر التعداد ہیں لیکن ان میں ''فردوس بریں'' کے علاوہ فن کی کسوٹی پر کوئی ایک بھی پورا نہیں اترتا''۔

مزید رقمطراز ہیں:

''ان کے ناولوں میں فردوس بریں ایک مکمل ناول ہے یہ ناول اگرچہ مختصر ہے لیکن اس پر شرر نے بڑی محنت کی ہے اس کا پلاٹ بڑا کھیلا اور نہایت متناسب ہے۔ اس میں کسی واقعہ کا بیان بیکار نہیں۔ قصے کی ابتداء متن اور انجام میں بڑا توازن نظر آتا ہے۔ اور ناول کے جملہ منازل حیات نہایت خوبی ''نفاست اور چابک دستی سے طے ہوتے ہیں۔

اس کے کرداروں میں حسین اور علی وجودی کے کردار جاں دار، روشن اور دلچسپ ہیں'' (ایضاً)

شرر کی منظر نگاری کے بارے میں سہیل بخاری لکھتے ہیں۔

''منظر نگاری میں البتہ شرر کو قدرے شہرت حاصل ہوگئی ان کے مناظر رنگین، تازہ اور جاندار ہوتے ہیں''۔ (ایضاً)

فردوس بریں کی منظر نگاری کے بارے میں ان کی رائے ہے۔

''منظر نگاری بھی ناول میں معتدل 'حسین' دلکش اور رنگیں ہے۔ خصوصاً جنت کی مرقع کشی تو غضب کی ہے اس میں شرر نے محرکات کا حق ادا کر دیا ہے۔

غرض شرر کے تمام ناولوں میں سب سے اچھا ناول یہی ہے بلکہ اردو کے ناولوں میں بھی اس کا ایک منفرد اور ممتاز مقام ہے''۔ (ایضاً)

کاشان اکیڈمی
0334 5504551
0300-5752486